دینی طریق حیات

(اے۔ کے۔ بروہی)

[ہمارے ملک کے ممتاز قانون دان جناب اے۔ کے۔ بروہی ایڈووکیٹ نے مارچ ۶۴ء میں پشاور یونیورسٹی کے زیر اہتمام آل پاکستان اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے اجلاس سوم کی صدارت کرتے ہوئے انگریزی میں ایک مقالہ "ریلیجس وے آف لائف" کے زیر عنوان پڑھا تھا جو اپنے عمدہ اور بصیرت افروز مندرجات کی بنا پر بہت پسند کیا گیا تھا اور پریس میں بھی اس کا کچھ خلاصہ اشاعت پذیر ہوا تھا ہم اس پورے مقالے کا ترجمہ افادہ عام کی غرض سے پیش کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ قارئین کے لیے اس کا مطالعہ دلچسپی و سودمندی کا موجب ہوگا۔ غ ع]

(۱)

دین و مذہب نے ایک قدیم انسانی ادارے کی حیثیت سے بشری آزادی کے صحیح استعمال میں بڑا مفید اور قابلِ قدر فریضہ سر انجام دیا ہے۔ جہاں آزادی موجود نہ ہو وہاں دینی زندگی کا وجود ممکن نہیں ہے، کیونکہ آزادیٔ عمل کے بعد ہی انسان کے افعال کے بارے میں خطا و صواب کا سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی لیے دین میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اوّلین مقام حاصل ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ انسان کے خالق نے اسے آزادیٔ و اختیار کا جو عظیم عطیہ عنایت فرمایا ہے وہ اسے صحیح اور بجا مصرف میں صرف کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ دین کے انتخاب میں جبر و اکراہ کو روا نہیں رکھا گیا۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے: لَآ اِکْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہے) جہاں جبر ہوگا وہاں آزادیٔ انتخاب مفقود ہو گی اور دین کا اصل منشا و مدعا اسی آزادیٔ انتخاب کے لیے قواعد و ضوابط مقرر کرنا ہے۔ جبر و اکراہ سے انسانی آزادی میں نظم و ضبط پیدا نہیں ہوتا،

بلکہ جبر سے حرّیتِ بشری کا کلی خاتمہ ہو جاتا ہے۔

کائنات کا مادّی و طبعی نظام اپنی ساری تفصیلات و جزئیات سمیت ایک "قانون لزوم" کا پابند اور مسخر ہے جس سے سرتابی اور انحراف اس کے کسی جزء کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اس کے برعکس انسان کے لیے حرّیت مقدر کر دی گئی ہے۔ اُسے قدرت نے آزادی ودیعت کی ہے جسے وہ متعین حدود کے اندر جس طرح چاہے استعمال کر سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اس امانت میں غلط طریق پر بھی تصرف کر سکتا ہے۔ لیکن اس طرح وہ اپنے روحانی ارتقاء اور نشو و نما ہی میں رکاوٹ پیدا کرے گا۔ دوسری طرف اُسے اس امر کے بھی مواقع حاصل ہیں کہ وہ اپنی آزادانہ رضا و اختیار کے ساتھ اپنے آپ کو قانون الٰہی کا تابع بنا لے اور اپنے خالق کے اوامر و نواہی کا پابند ہو جائے۔ انسان کی آزادی اس حقیقت کی متضمن ہے کہ وہ زندگی کے ہر قدم پر دو یا اس سے زاید راستے اختیار کر سکتا ہے۔ انسان کے ایک اخلاقی وجود ہونے کا مطلب اوّلاً یہ ہے کہ اُسے یہ معلوم ہو کہ مختلف طرزہائے عمل میں سے صحیح اور جائز کونسا ہے، اور ثانیاً یہ کہ اُسے اتنی قوتِ ارادی حاصل ہو کہ وہ جس طریقے کو درست سمجھے، اُسے اختیار کر سکے۔ غرض یہ کہ خیر کی دعوت قبول کرنا، نیکی اور بدی میں تمیز کرنا اور اس کے بعد بُری ترغیبات کی جانب مائل ہوئے بغیر صراطِ مستقیم پر گامزن رہنا اخلاقیات کا اصل الاصول ہے۔

(۲)

ذی شعور انسان کے آغاز تخلیق ہی سے دین نے انسان کی تعلیم و تہذیب میں دوگونہ خدمت انجام دی ہے۔ اس نے پہلے انسان کو حق و باطل کا ایک تصور اور معیار عطا کیا ہے اور پھر اسے ایسے جذبے سے سرشار کیا ہے کہ وہ جس رستے کو حق سمجھتا ہے، اُسے اختیار کر لیتا ہے۔ حق اور ناحق کے معاملے میں اگرچہ بشری تصورات میں تبدیلی واقع ہوتی رہی ہے لیکن یہ بات اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے کہ انسان حق اور باطل کے مابین امتیازی تصور سے کبھی خالی نہیں رہا۔ ریڈ انڈین اپنے دشمن کی کھوپڑی اتار لینا اخلاقاً صحیح سمجھتا ہے اور ایک نرم دل راہبہ اگر جمعہ کے روز گوشت کھائے

تو وہ ابدی جہنم کے خوف سے کانپتی رہتی ہے۔ ان دونوں کے حق و باطل کے تصورات اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن دونوں بہر حال ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوتے ہیں جس میں انہیں جائز اور ناجائز کے درمیان تمیز کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ اس حق و باطل اور جائز و ناجائز کو جانچنے کا معیار ہمیشہ انسان کے دینی تخیلات مہیا کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بعض فلسفیوں نے اخلاقیات کی بنیاد محض معقولات پر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر بعض لوگوں نے اُس فعل کو اخلاقاً صحیح قرار دیا ہے جو زیادہ سے زیادہ انسانوں کے لیے بیش از بیش مسرّت کا باعث ہو۔ بعض دوسرے لوگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ غیر اخلاقی افعال وہ ہیں جن سے نہ صرف افراد کو ضرر پہنچتا ہے بلکہ ان سے وہ پُورا معاشرہ تباہ و برباد ہوتا ہے جس میں ایسے افعال کا عادتاً ارتکاب کیا جائے۔ لیکن اس بات کا اعتراف فلسفے کے ذہین طالب علموں نے بار بار کیا ہے کہ اگر اخلاق کی اساس کسی دینی شعور و ضابطہ پر استوار نہ ہو تو محض منطقی استدلال کی بودی اور ریتلی بنیادوں پر اخلاق کی عمارت کھڑی نہیں کی جاسکتی۔ اس لحاظ سے یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ انسانی کی فطری ساخت میں دین اور مذہب کا شعور ازل سے پیوست کر دیا گیا ہے اور یہ بعض ایسی حقیقتوں اور سچائیوں پر مبنی ہے جو عالمگیر شرائع کے پیش کرنے والے انبیاء علیہم السلام پر منکشف ہوتی تھیں۔

ڈی ٹاکی وائل DE TOCQUEVILE اپنی مشہور کتاب "امریکہ میں جمہوریت" میں ایک جگہ لکھتا ہے:

"کوئی انسانی فعل، خواہ وہ کتنا ہی حقیر اور جزئی کیوں نہ ہو، ایسا نہیں ہے جس کا سرچشمۂ آغاز ان عمومی تصوّرات میں نہ پایا جاتا ہو جو انسان اپنے اللہ، اپنے روحانی وجود یا دیگر بنی نوعِ انسان کے بالمقابل اپنے حقوق و فرائض کے بارے میں رکھتا ہے۔ کوئی امر اس میں مانع نہیں ہے کہ ان سب کا ماخذ اور مبدأ ایک ہی ہو۔ لہٰذا تمام انسانوں کو اس بات سے غایت درجہ کی دلچسپی ہے کہ اللہ، روح، حقوق اللہ اور حقوق العباد

سے متعلق ان کے اعتقادات بالکل واضح اور متعیّن ہوں۔ کیونکہ ان اصولِ اولیہ کے معاملے میں شک اور تذبذب ان کے جملہ اعمال کو بخت و اتفاق کے حوالے کر دیگا اور انہیں اختلال اور اضمحلال کا شکار بنا کے رکھ دے گا۔ چنانچہ یہ وہ موضوع ہے جس پر ہم میں سے ہر ایک کے تصورات کا نہایت صاف اور دوٹوک ہونا انتہائی ضروری ہے، اور پھر دقت یہ ہے کہ اس میں اگر ہر فرد کو اپنی اپنی عقل سے کام لینے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس کے لیے ان امور کا طے کرنا بھی سخت مشکل ہے۔ ان حقائق کا ادراک کرنا اور ان کی تہ تک پہنچنا صرف ایسے قلوب و اذہان کا کام ہے جو زندگی کے عام تفکرات سے بالاتر ہوں اور جو باریک بینی، جزرسی، بصیرت اور تدبر کے حامل ہوں۔ فی الحقیقت ہم دیکھتے ہیں کہ فلاسفر ابھی تک ارتیاب اور شکوک و شبہات میں گھرے ہوتے ہیں۔ ہر قدم پر عقلی روشنی جو انہیں راستہ سجھاتی ہے، مدھم اور دھندلی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اپنی ساری کوششوں کے باوجود ابھی تک وہ چند ایسے متصادم اور متناقض نظریات وضع کر سکے ہیں جن کی پیروی میں ہزاروں سال سے انسانی دماغ بھٹکتے پھر رہے ہیں، بغیر اس کے کہ حقیقت تک رسائی ہو سکے یا خطا کے ارتکاب ہی میں کسی جدت طرازی سے کام لیا جاتے۔ اس نوعیت کا مطالعۂ کائنات ایک عام آدمی کے بس کا کام نہیں ہے۔ اور اگر انسانوں کی اکثریت اس قسم کے مشاغل کی اہل ہو بھی سہی، تب بھی انہیں سرانجام دینے کی فراغت ہر شخص کو حاصل نہیں ہے۔"

مصنف مذکور خالقِ کائنات اور فطرتِ انسانی سے متعلق قطعی اور متعیّن معتقدات کی ضرورت کو واضح کرنے کے بعد یہ بیان کرتا ہے کہ مذہب اس انسانی ضرورت کو بطریقِ احسن پورا کرتا ہے۔ اس کے الفاظ درج ذیل ہیں:

"مذہب کا اوّلین مقصود اور اس کا اہم ترین فائدہ یہ ہے کہ وہ عامۃ الناس

کے لیے ان بنیادی سوالات کا ایسا جواب دیتا ہے جو بالکل صاف، عام فہم، دو ٹوک اور پائدار ہے۔ بلاشبہ بعض مذاہب باطل اور لغو ہیں، لیکن یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ جو مذہب اپنی تعلیمات کو مذکورہ بالا حقائق کے دائرے تک محدود رکھتا ہے اور جو انسان کے دل و دماغ کو چاروں طرف سے محدود و مسدود نہیں کر دیتا وہ درحقیقت ذہنی قوی کے لیے ایک منفعت بخش بندش کا کام دیتا ہے، اور اس امر کا اعتراف ناگزیر ہے کہ ہر مذہبی ضابطہ خواہ وہ دوسری دنیا میں باعث نجات ہو، یا نہ ہو لیکن کم از کم اس دنیا میں تو وہ ہمیں عظمت و مسرت سے ہمکنار کرتا ہے۔"

"جو لوگ "آزاد دنیا" میں آباد ہیں، ان کے معاملے میں یہ بات خاص طور پر صحیح ہے۔ جب ایک قوم کا مذہب تباہ ہو جاتا ہے تو اس کی اعلیٰ فکری صلاحیتیں تشکیک و تذبذب کی زد میں آجاتی ہیں اور قوت کارکردگی مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کا ہر فرد اپنے اور دیگر افراد سے تعلق رکھنے والے اہم مسائل کے بارے میں صرف پراگندہ اور تغیّر پذیر خیالات اپنے ذہن میں رکھتا ہے اس کی آرا بڑی غیر معیّن سی ہوتی ہیں جنہیں بآسانی ترک کیا جا سکتا ہے۔ انسانی تقدیر سے تعلق رکھنے والے مشکل سوالات حل کرنے سے جب وہ مایوس ہو جاتا ہے تو وہ نہایت بے جمیتی کے ساتھ ان کے بارے میں سوچ بچار ترک کر دیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں رُوح پژمردہ ہو جاتی ہے، عزم و ہمت کے سرچشمے سوکھ جاتے ہیں اور عوام الناس غلامی کے لیے بالکل تیار ہو جاتے ہیں۔"

یہی فوائد ہیں جو دینی طرزِ حیات سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ ہمیں ذہن کی بہت سی بے کار اور لاطائل داخلی الجھنوں میں مبتلا ہونے سے نجات بخشتا ہے۔ ایک اجنبی کائنات کے اندر ہمیں یہ احساسِ یگانگت بخشتا ہے۔ یہ ہماری زندگی کے بہت سے کھردرے اور ناموس پہلوؤں کو نرم کر کے

ہماری طاقتوں کو کفایت شعاری کے ساتھ صرف کرنا ہے۔

(۳)

دین کی حقانی تعلیمات ہمیں ایک اعلیٰ ذریعہ اور مآخذ سے حاصل ہوتی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام جنہوں نے دینی طرز فکر و حیات کی بنا رکھی ہے، انہوں نے وحی کی وساطت سے پیغام الٰہی وصول کر کے اسے انسانوں تک پہنچایا ہے۔ یہ کام انہوں نے ادراک و شعور کی ایک ایسی سطح پر فائز ہو کر کیا ہے، جس تک پہنچنا اور جس کا مشاہدہ کرنا براہ راست ہمارے لیے محال ہے۔ پیغامِ رسالت پر ایمان لانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس بات پر یقین کامل رکھیں کہ یہ ایک نادر اور غیر معمولی ذریعۂ علم ہے جو عام بشری احساس و شعور سے ماوراء ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفیانہ نظریات اور دینی تعلیمات کا باہم موازنہ و مقابلہ غیر ممکن اور بے معنی ہے۔ عام انسانی علم عارضی ہے جس میں نئے تجربات و انکشافات کے بل پر ہر آن ترمیم و تغیر ہو سکتا ہے لیکن انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات ایک بالکل ہی دوسری بنیاد پر استوار کی گئی ہیں جس میں آئے دن تبدیلی کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی آیئے دیکھیں کہ امام غزالی اپنی مشہور تصنیف "المنقذ من الضلال" میں اس موضوع پر کیا ارشاد فرماتے ہیں:

"ایمان بالرسالت کے باوجود جو لوگ دینی احکام کو فلسفیانہ اصول و نظریات کی سطح پر رکھتے ہیں، وہ درحقیقت رسالت کا انکار کرتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک نبی کی حیثیت ایک مردِ دانا سے زیادہ کی نہیں ہے جسے ایک بالاتر ہستی نے رہنما مقرر کیا ہے۔ اس سے منصب نبوت کا استخفاف لازم آتا ہے۔ ایمان بالرسالت کا مطلب تو یہ ہے کہ ہمارے علم و حواس سے بالاتر ایک دوسرا عالم ایسا موجود ہے جس سے تعلق رکھنے والوں پر ایسے حقائق کا انکشاف ہوتا ہے جن کا عام عقل انسانی براہِ راست ادراک نہیں کر سکتی۔ بالکل اسی طرح جس طرح کان ان اشیاء کا مشاہدہ نہیں کر سکتے، جنہیں آنکھ دیکھ سکتی ہے اور ذہنی تخیلات حواس خمسہ کے ادراک میں نہیں آ سکتے۔"

غرض صورتِ حال یہ ہے کہ ایک طرف عقلِ انسانی اپنی ضعیف قوتِ مشاہدہ کے بل پر کلّی نظمِ کائنات کا احاطہ نہیں کر سکتی اور کاروبارِ حیات کو کامیابی سے چلانے کے لیے انسان کی خاطر کوئی ضابطۂ عمل وضع نہیں کر سکتی۔ لیکن دوسری طرف اس معاملے میں کسی اہل تر اور مجاز شخصیت کی رہنمائی کی اشد ضرورت ہے جو ان معاملات میں ذمہ دارانہ کلام کر سکتا ہو۔ چنانچہ بنی نوعِ انسان نے بار بار احسان مندی کے ساتھ ان بزرگوں کی طرف رجوع کیا ہے جنہوں نے وحی کی بنا پر انسان کے ماضی و مستقبل کے بارے میں علمِ حقیقت کا دعویٰ کیا ہے اور اپنے اسوۂ حسنہ کے ذریعے سے انسان کی نجات کا راستہ پیدا کیا ہے۔ علمِ جدید کی مدد سے قدرتی طاقتوں کو مسخر کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ جو حقیقت پردے کے پیچھے مستور ہے، اس کے رازہائے سربستہ کو منکشف کر دیا گیا ہے۔ جدید یورپ کا مردِ حکیم اور سوئٹزرلینڈ کا مشہور ماہرِ نفسیات سی جی جنگ اسّی سال کی پختہ عمر میں اپنی سوانحِ عمری شائع شدہ ۱۹۶۰ء (MEMORIES, DREAMS, REFLECTIONS) "خواب و خیال اور یادِ ایام" میں یوں رقمطراز ہے:

"میرے لیے اس بات کا تعین ناممکن ہے کہ کیا چیز آخر کار قدر و قیمت کی حامل ہے اور کیا نہیں ہے۔ میں اپنے آپ اور اپنی زندگی کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگا سکتا۔ مجھے کسی شے کا یقین حاصل نہیں ہے۔ میرے فی الحقیقت کسی معاملے میں پختہ اور واضح معتقدات نہیں ہیں۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ میں پیدا ہوا تھا اور زندہ ہوں اور مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ "میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں"۔ میرا وجود کسی ایسی دوسری بنا پر مبنی ہے جسے میں نہیں جانتا"

اسرارِ حقیقی کے بالمقابل انسان کی یہی بے بسی اور بے چارگی ہے، جس سے نکالنے کے لیے دین کی آفاقی دعوت کی صدا اس کے کانوں تک پہنچتی ہے اور اسے نسلِ انسانی کے نجات دہندگان انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے سیدھا راستہ دکھاتی ہے۔ انسان یہ دیکھتا ہے کہ اس کا وجود مقید و محدود ہے اور وہ موت کے پنجے سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ موت کا

تیقن، دائمی کشمکش، اور غم والم اُسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ اس عقدۂ حیات کو حل کرے جو مجرّد عقل و فکر کی زد میں نہیں ہے۔ انسان جیسے جیسے زندگی کا سفر طے کرتا ہے، اُس کے قویٰ مضمحل ہوتے چلے جاتے ہیں، موت کی منزل اُسے قریب تر نظر آتے لگتی ہے اور وہ اس وسیع کائنات میں اپنے آپ کو تنہا، ضعیف اور بے بس محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس وقت فکر و تخیّل کی ساری جولانیاں ایک غیر حقیقی سراب معلوم ہوتی ہیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ وحیِ قرآنی پر کان دھرنے کیلئے انسان آمادہ ہو جاتا ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ ۙ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ۔ (الملک: ۱-۲)	برکت والی ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہے بادشاہی اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، جس نے پیدا کیا موت اور زندگی کو تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں بہتر ہے اور وہ زبردست اور بخشنے والا ہے۔
اَلَّذِیْنَ یَسْتَحِبُّوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَیَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِكَ فِیْ ضَلٰلٍۭ بَعِیْدٍ۔ (ابراہیم: ۳)	وہ لوگ جو زیادہ پسند کرتے ہیں دنیوی زندگی کو آخرت سے اور روکتے ہیں اللہ کے رستے سے اور اس میں کجی چاہتے ہیں، یہی دور کی گمراہی میں ہیں۔

قرآن مجید رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے متبعین کا مشن ایسے الفاظ میں بیان فرماتا ہے جن سے بہتر الفاظ نہیں مل سکے:

كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۱۰۹)	تم ایک بہترین امت ہو جو نکالی گئی ہے سب لوگوں کے لیے تم حکم دیتے ہو بھلائی کا اور روکتے ہو برائی سے۔

دینِ اسلام ایک عملی ضابطۂ حیات ہے جو انسان کو اپنے مستقبل سے آگاہ کرتا ہے اور

اُسے دانائی اور پاکیزگی سکھاتا ہے۔ یہ آدمی کو تلقین کرتا ہے کہ وہ اللہ کی رضا کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں اور خیر و صلاح کے راستے کی پابندی کریں۔ اسلام اپنے پیرووں کو حکم دیتا ہے کہ وہ نیکی کا اتباع کریں، اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے چلنے سے باز رہیں اور باطل کی طاقتوں سے مغلوب نہ ہونے پائیں۔

اسلام نے انسان کے سامنے جو معیارِ کمال رکھا ہے اس پر عمومی لحاظ سے دو زاویہ ہائے نظر سے نگاہ ڈالی جا سکتی ہے۔ انفرادی نقطۂ نظر سے اس معیار کا تقاضا یہ ہے کہ ہر مسلمان "متقی" بن جائے۔ دوسرے لفظوں میں ہر شخص کے اندر ضبطِ نفس کا مادہ پیدا ہو جائے۔ ایک فرد کی شخصی زندگی میں قانون کا منشا یہ ہے کہ اُسے اپنی ذات پر پُورا قابو حاصل ہو جائے۔ آدمی کا یہ حال نہ ہونا چاہیے کہ وہ ہر ایسے واہمے اور وسوسے کے سامنے سپر ڈال دے جو کبھی عارضی طور پر طاری ہو جائے بلکہ اُسے اپنی طبیعت پر پُورا کنٹرول ہونا چاہیے۔ آدمی کو ہر وقت چوکنا اور بیدار ہونا چاہیے اور اُسے اپنے رب کی مرضیات کی تکمیل کے لیے دل و جان سے آمادہ رہنا چاہیے۔ جہاں تک اجتماعی معاشرے کا تعلق ہے، خواہ وہ ایک گروہ ہو، ایک قوم ہو، ریاست ہو یا پُوری بنی نوع انسان ہو، اس میں مسلمان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ وہ انسانی وحدت اور یکتائی کے لیے کوشش کرے اور اُن تمام منافشات و تنازعات کو ختم کرنے کی جدوجہد کرے جو انسان کو انسان سے پھاڑتے ہیں اور لڑائی جھگڑے کو جنم دیتے ہیں۔ اسلام ان تمام امتیازات کو بے وقعت سمجھتا ہے جو نسلی اور لسانی بنیاد پر یا محض دولت و اقتدار کے بل پر قائم ہوتے ہیں۔ اس کے بجائے اسلام انسانوں کو ایک ایسے روحانی اور ایمانی رشتے میں پروتا ہے جو پُوری انسانیت کو باہمدگر پیوست کر دیتا ہے اور ان کے مابین ایک دائمی وحدت پیدا کرتا ہے۔

آئندہ کے صفحات میں مسلمان کی انفرادی اور اجتماعی تکمیل کے انہی دونوں پہلوؤں کے بارے میں چند ملاحظات پیش کیے جائیں گے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ اسلام فرد اور معاشرے

کی تنظیمِ حیات کے ضمن میں جو فیصلہ کُن فریضہ انجام دے سکتا ہے، اسے سمجھنے میں آسانی ہو۔

(۴)

جہاں تک تکمیلِ ذات کا تعلق ہے، اسلام سب سے پہلے ایک ایک فرد کی سیرت کو تزکیۂ نفس کے ذریعے سے بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسلام کی نگاہ میں اصلاحِ خلق کا مسئلہ بنیادی طور پر اصلاح ذات ہی سے وابستہ ہے۔ مسلم معاشرہ انجامِ کار متقی اور خدا ترس مسلم افراد ہی سے ترکیب پاتا ہے۔ جس طرح ایک حیاتیاتی جسد کی صحت کا انحصار بہت بڑی حد تک ان انفرادی خلیات کی صحت پر ہے، جن سے وہ جسد مرکب ہے، اسی طرح نوعِ انسان کی صحت و قوت کا پیمانہ اسلام کے نزدیک ان افراد (ذکور و اناث) کی اخلاقی و رُوحانی صحت و توانائی ہے جن پر وہ نوع مشتمل ہے۔

تکمیلِ ذات کا نظریاتی پس منظر اُن دو اعلانات میں صاف نظر آجاتا ہے جن کا مطالبہ ہر اُس شخص سے کیا جاتا ہے جو دائرۂ اسلام میں داخل ہو۔ پہلا اعلان ہے: لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ (اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں)، دوسرا ہے: محمد رسول اللّٰہ (محمد اللہ کے رسول ہیں)۔ یہ دوگونہ اعلان و اقرار ہر مسلمان پر لازم و واجب ہے۔ اسلام میں اسے کلمۂ شہادت کا نام دیا گیا ہے، جس کے لغوی معنی تصدیقی اور شہادتی بیان کے ہیں گویا کہ یہ ایک ایسی سچائی ہے جس کی حقانیت پر ہم گواہی دیتے ہیں۔ اس طرح ایک مسلمان توحید کا مسلسل اقرار کرتا رہتا ہے اور چونکہ اس علم توحید کا ذریعہ اور واسطہ اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس لیے توحید کے ساتھ ساتھ آنحضورؐ کی رسالت کا اعلان بھی لازم ہے۔ یہ اثبات توحید کوئی ایسا استنباط و استنتاج نہیں ہے جسے محض ذہنی کاوش کے بل پر پیش کیا جا سکے۔ کیونکہ ذہن خواہ کتنا ہی رسا کیوں نہ ہو وہ اس طرح کا نتیجہ اخذ کرنے کا اہل نہیں ہے۔ آدمی اس کرۂ ارضی پر محض چند لمحات کے لیے وجود میں آتا ہے اور جو کچھ اس کے گرد و پیش میں جلوہ گر ہوتا ہے، وہ اس کی اطلاع محض حواس کے واسطے سے پاتا ہے جو بجائے خود محدود ہیں۔ زمان و مکان نہ صرف ہمارے حواس سے ماوراء ہیں، بلکہ وہ کسی منطقی

استدلال کی گرفت میں بھی نہیں آسکتے۔ جیسا کہ کانٹ نے اطمینان بخش دلائل کے ساتھ ثابت کر دیا ہے، چونکہ وہ انسانی علم کے لیے شرائط و وسائط کا درجہ رکھتے ہیں، اس لیے وہ ہمارے علم کے احاطے میں نہیں آسکتے۔ اسی طرح ماضی کی معلومات کے لیے ہمارا عام ذریعہ یا تو مؤرخوں کے بیانات ہیں جو دستیاب شہادتوں پر مبنی ہو سکتے ہیں یا آثار قدیمہ سے متعلق وہ تحقیقات و انکشافات ہیں جو ہمارے لیے ممکن الحصول ہیں۔ لیکن انسان میں فکری تجزیے کی طاقتیں خواہ کتنی ہی عمیق اور فیصلہ کن کیوں نہ ہوں، وہ کسی عقلی استدلال کے ساتھ زندگی کی وحدت کو پایۂ ثبوت تک نہیں پہنچا سکتا اور نہ کسی ایسے اصولِ مشترک کا ادراک کر سکتا ہے جو نہ صرف نسلاً بعد نسلٍ زندگی کی چند اشکال میں رابطہ تلاش کر سکے، بلکہ ایک ہی وقت اور زمانے میں پوری کائنات کے اندر جو مظاہر حیات پھیلے ہوتے ہوں، ان میں باہمی تعلق کا بھی سراغ لگا سکے۔ اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو توحیدِ الٰہ ایک ایسی سچائی ہے جس تک رسائی محض وحی رسالت پر ایمان بالغیب لانے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

وحیٔ قرآنی ہمیں بتاتی ہے کہ:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ	کہہ دو وہ اللہ ایک ہے
وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ	اور ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہے
هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ	وہی ذات ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا۔

یہ ایسے حقائق ہیں جن کا اثبات محض تجرباتی طریق پر نہیں ہو سکتا اور نہ عام انسانی شعور کے بل پر ان کا ادراک ہو سکتا ہے۔ محض ایک رسول کے حوالے ہی سے ان پر ایمان لایا جا سکتا ہے۔

کلمۂ شہادتین کا شمار اسلام کے بنیادی ارکان میں سے ہے اور یہ دونوں شہادتیں بہت بڑی افادیت کی حامل ہیں۔ یہ انسان کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کراتی ہیں، جو ان میں مضمر ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ ان تمام اختلافات و تنازعات کے باوجود، جنہوں نے انسان کو اقوام و طبقات میں منقسم کر رکھا ہے، بنیادی طور پر پوری انسانیت ایک وحدت اور اکائی ہے اور ایک انسان کے سامنے اعلیٰ ترین نصب العین اور مطمح نظر یہی ہو سکتا ہے کہ وہ پوری نسلِ انسانی کو رشتۂ وحدت

میں منسلک کردے۔

روزے کی عبادت کی شکل میں تقویٰ یعنی ضبطِ نفس اپنی معراجِ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ اس مہینے میں ایک مجازی رنگ ہی میں سہی، انسان اپنے ایک روحانی وجود ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ ایک مسلمان کے لیے ساری زندگی اور بالخصوص اس مہینے میں اپنے اندر یہ احساس بیدار کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ محض کھانا پینا اور نفسانی خواہشات کو پورا کرنا مقصودِ حیات نہیں ہے۔ یہ نفسانی خواہشات تو محض بقائے نفس اور بقائے نوع کا ایک ذریعہ ہیں۔ ان سے بالاتر ایک عالمِ روحانی بھی موجود ہے، جس میں انسان داخل ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنے اندر اللہ کے لیے عبودیت اور محبت کے جذبۂ خوابیدہ کو جگانے کے سامان فراہم کرے۔

انسان بالعموم نیکی کے قوانین کا اتباع اس لیے نہیں کرتا، کہ اس کی حیوانی جبلّتیں جو اس کے اندر مضمر ہیں، اس پر غالب آجاتی ہیں اور وہ اس کی زندگی میں محکوم رہنے کے بجائے اس پر حاکم بن جاتی ہیں۔ روزہ کم از کم کچھ مدّت کے لیے اس حیوانی غلبے کو منقطع کر دیتا ہے اور اس طرح انسان کے اندر اُس ملکوتی صفت کو نشوونما دیتا ہے جو اپنے اُس رب اور خالق سے محبت کا دم بھرتی ہے جس نے اُسے زندگی اور اُس کے جملہ انعامات عطا کیے ہیں۔

رمضان کے خاتمے پر بطورِ شکرانہ عید الفطر منائی جاتی ہے جو ایک مسلمان کی سالانہ زندگی کا سب سے اہم دن ہے۔ روزے کے ماہانہ تربیتی ضابطے کی پابندی کے بعد مسلمان اپنی بستی کی نمازِ عید میں شریک ہوتا ہے اور اس امر کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ وہ کس حد تک اپنے نفس پر قابو پا سکا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے اس زمانے میں بے سمجھ لوگوں کے نزدیک عید کا یہ دن محض رنگ رلیاں منانے کے لیے وقف ہو چکا ہے۔ گویا کہ یہ دن اپنے ساتھ بدمستیوں اور بداعمالیوں کے لیے ایک عام لائسنس لے آتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ دن ایسا ہے، جس دن رمضان کی غیر معمولی بندشوں کو ڈھیلا کر دیا جاتا ہے اور مسلمان کو اپنے مشاغل میں نسبتہً آزاد کر دیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود اس سے توقع یہ کی جاتی ہے کہ وہ روزے کی تربیت سے فائدہ اٹھا کر

نیکی کی جانب زیادہ راغب اور برائی سے زیادہ مجتنب ہوگا۔ روزے کا اصل مقصد یہ ہے کہ زندگی کے طرزِ عمل میں ایک باطنی انقلاب رونما ہو جائے اور انسان کے اخلاقی نقطۂ نظر میں ایک دائمی اور مستقل تغیر پیدا ہو جائے۔ روزے کے نتیجے میں جو اخلاقی و روحانی ثمرات ایک مومن کو حاصل ہوتے ہیں، انہی کو دوسروں کے سامنے پیش کرنے کے لیے اور انہی پر اپنے رب کا شکرانہ ادا کرنے کے لیے وہ نمازِ عید میں شامل ہوتا ہے۔

(۵)

اس میں شک نہیں کہ انسانی اخوت کے اجتماعی نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے اسلام کا اوّلین پروگرام نماز باجماعت ہے، لیکن اس کا عظیم ترین مظاہرہ ہر سال حج کے موقع پر ہوتا ہے جبکہ تمام مسلمانانِ عالم ساری دنیا سے کھچ کر اور سمٹ کر مکہ معظمہ میں جمع ہوتے ہیں اور خدا کے بیت گھر خانۂ کعبہ کے گرد کفن نما احرام باندھ کر اور تمام مصنوعی دنیوی نشانات و امتیازات سے مبرّا ہو کر اکٹھے طواف کرتے ہیں۔ محلّے کی مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی فضیلت اور قدر و قیمت محتاجِ بیان نہیں ہے۔ نماز اگرچہ گھر میں یا دوسری جگہ بھی پڑھی جا سکتی ہے لیکن نماز اور بالخصوص نماز جمعہ کا مسجد میں باجماعت ادا کرنا نہایت ضروری اور موکّد ہے۔ یہ مسلمانوں کی اجتماع گاہ ہے۔ مسجد کے لغوی معنی سجدہ کی جگہ کے ہیں۔ لیکن اجتماعی عبادت کی عظمت و شان سب سے زیادہ حج کے موقع پر نمایاں ہوتی ہے لاکھوں کی تعداد میں ہر سال دنیا کے مختلف گوشوں سے چل کر مسلمان بیت اللہ کا قصد کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ مختلف قوموں کے افراد ہوتے ہیں، لیکن اس مقام پر وہ ایک ہی انسانی برادری کے ارکان ہونے کی حیثیت میں اپنے رب کے حضور میں حاضر ہوتے ہیں۔ وہ ایک ہی خدا کے عاجز بندے ہیں جن کو محض دینی اور ایمانی رشتے نے ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ کر دیا ہے۔ بلاشبہ اس تعلق نے انہیں ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا ہے۔

اخوتِ بشریہ کے قیام کے لیے اسلام نے جو انقلاب برپا کیا ہے، اس کی اہمیت کو ابھی تک پورے طور پر سمجھا نہیں جا سکا۔ اسلام کے ماسوا انسانیت کی تنظیم کے لیے دو عناصر سے کام

لیا گیا ہے۔ ان میں ایک خون کا رشتہ ہے اور دوسرا جغرافیائی اور مادی اتّصال ہے جو زمین کے باشندوں کے مابین پایا جاتا ہے۔ ایک قبیلے کے افراد کی رگوں میں مشترک خون کا گردش کرنا یا ان کا ایک ہی خطّہ زمین میں بسنا، بس یہی وہ عوامل تھے جن کے بل پر مردوں اور عورتوں کو ایک منظم معاشرے کا جزو بنایا جاتا تھا۔ اجتماعی گروہ بندی کے لیے اسی نسلی یا مادی اتّصال پر انحصار کیا جاتا تھا۔ اس نقطۂ نظر کی تنگی اور محدودیّت کا اندازہ صرف ایک حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ اس طرح کی تنظیم میں ان عوامل سے اپیل کی جاتی تھی اور وہی اس کی رکنیت کو مستقل طے کر دیتے تھے جن کا انسانی فطرت کی ان اخلاقی صفات سے کوئی تعلق نہ تھا جو انسان کو حیوان سے ممیّز کرتی ہیں۔ خاک و خون کے رشتے تو حیوانات کو بھی ایک جگہ اکٹھا کر سکتے ہیں۔ انسان کو انسان سے پیوستہ کرنے کے لیے تو کوئی قلبی اور روحانی رشتہ ہونا چاہیے اور یہی وہ رشتہ ہے جس پر اسلام نے زور دیا ہے۔ اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ انسانیت کو ایک ہی سلکِ تنظیم میں منسلک کرنے کے لیے ایمانی رشتہ درکار ہے اور اسی کے ذریعے سے تمام انسان ایک ہی لڑی میں پروئے جا سکتے ہیں۔ اسلام نے مادی علائق کے بجائے معنوی اور اعتقادی رشتے کو رابطے کا ذریعہ بنایا ہے، اور غیر مبہم طریق پر اعلان کر دیا ہے کہ عرب کو غیر عرب پر کوئی فضیلت نہیں اور خدا کے نزدیک زیادہ معزز وہ ہے جس میں سب سے زیادہ تقویٰ اور ضبطِ نفس ہے۔ اسلام اس نقطۂ نظر کو قبول نہیں کرتا کہ مختلف نسلی، جغرافیائی یا قومی امتیازات کی بنا پر انسانوں میں کوئی خاص فرق واقع ہوتا ہے، بلکہ نہایت واضح الفاظ میں یہ بیان کرتا ہے کہ یہ محض ایک ذریعۂ تعارف ہیں۔

اسلام میں انسانیت کے جوہر اور اس کے عزّ و شرف کا معیار بالکل دوسرا ہے اور اسی امتیازی وصف کی بنا پر ایک انسان اور دوسرے انسان کے مابین مواخات و مواسات کا تعلق قائم ہوتا ہے۔ اسلام کے ہجرتِ عامہ کے حکم نے تاریخِ انسانی میں نسلی، لسانی اور قومی گروہ بندیوں سے بالاتر ایک نرالا تصوّر یگانگت پیش کیا ہے۔ اسلام میں انسانیت کا تخیل یہ ہے کہ یہ ایک قافلہ یا کارواں ہے جس کی مختلف ٹولیاں اس احساس اور جذبے کے تحت رواں دواں ہونی چاہییں کہ ہم سب خدا ہی کے لیے ہیں اسی کی طرف پلٹ کر جا رہے ہیں اور ہم ایک ہی منظم اور مربوط برادری کے افراد ہیں۔

میں نے ایک عمومی انداز میں انفرادی کمال اور اجتماعی استحکام سے متعلق اسلامی نصب العین کے مضمرات کو بیان کر دیا ہے جو انسانیت کو ایک وحدت میں تبدیل کر کے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد اب میں ایک ایسے مسئلے کی جانب متوجہ ہوں گا جو دنیا کے سوچنے سمجھنے والے ہر مرد و عورت کے ذہن پر حاوی ہے اور اس کا کوئی حل تلاش کیے بغیر تیسری عالمگیر جنگ کے عذاب سے آدمیت کو بچانا محال ہے۔

(۶)

جس مسئلے کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے وہ دراصل یہ ہے کہ اس وقت کی دنیا میں ایک طرف آمریت اور مطلق العنانی کے علمبردار اور دوسری طرف فرد کی آزادی کے نقیب جو متقابل دعوے اور نظریات پیش کر رہے ہیں ان کے مابین محاکمہ اور تصفیہ کس طرح کیا جائے؟ ان دعاوی کی پشت پر جو فکری و نظری اختلافات کام کر رہے ہیں وہ ان سیاسی اور معاشی نظاموں میں صاف دکھائی دیتے ہیں جو "آزادی پسند" اور "کلیت پسند" معاشروں میں آج کل رائج ہیں۔ کلیت پسند ریاستیں کلی اقتدار و تصرف کی مدعی ہیں۔ ان کے نزدیک فرد کی زندگی غیر اہم اور غیر حقیقی ہے اور اس کے بالمقابل ریاست کی زندگی کو زیادہ حقیقی اور قیمتی فرض کیا جاتا ہے۔

مارکسی نظریئے کے مطابق کلیت پوری انسانی تاریخ کی مادی نقطۂ نظر سے تعبیر کرتی ہے۔ مارکسی طرزِ فکر کے مطابق وہ فیصلہ کن عوامل جو انسان، اس کے شعور، تخیلات، اس کی صلاحیتوں، تمناؤں اور خدشات کی تخلیق کرتے ہیں وہ محض اُس خارجی دنیا کا ردِ عمل ہیں، جس میں وہ جیتا، چلتا پھرتا اور تعلقات قائم کرتا ہے۔ کارل مارکس نے اس ضمن میں اپنی کتاب "پولیٹیکل اکا ی پر تنقیدی اضافہ" CONTRIBNT-ION-TO-CRITIQUE OF POLITICAL ECONOMY میں جو کچھ لکھا ہے وہ درج ذیل ہے:

"انسان معاشرے میں مختلف اقسام کی پیداوار کو وجود میں لانے کے لیے دوسروں سے اس طرح کے روابط قائم کرتا ہے جو ناگزیر ہوتے ہیں اور جن میں اس کی مرضی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ روابط مادی قوتِ پیدائش کے ایک خاص ارتقائی مرحلے سے تعلق رکھتے ہیں پیدائش

اشیاء پر مبنی ان روابط کا مجموعہ ہی معاشرے کی اقتصادی ہیئت کو تشکیل کرتا ہے اور یہی وہ حقیقی بنیاد ہے جس پر قانون و سیاست کی بالائی منزلیں تعمیر ہوتی ہیں اور جن کے مطابق اجتماعی شعور مخصوص سانچوں میں ڈھلتا ہے۔"

کارل مارکس کی ایک بعد کی وضاحت اور تعبیر کے مطابق اجتماعی شعور کی یہ "متعین شکلیں" وہ نظامہائے فکر و تخیل ہیں جو انسان کے لیے اجتماعیت کی حقیقت کے ادراک کا باعث بنتی ہیں" گویا کہ مارکسی طرزِ فکر کے مطابق انسان ایک ڈرامے کے بے بس تماشائی کا کردار ادا کرتے ہیں، جس کا انجام پہلے سے طے شدہ ہے اور جس میں انسان زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس جدلی عمل کی رفتار کو زود آمیز کر دیں جو "حقیقتِ اجتماعیہ" کو غیر طبقاتی سوسائٹی کے آخری مرحلے تک پہنچانے کے لیے بہر حال جاری ہے۔ بلکہ تاریخ کی مارکسی اور معاشی تعبیر کے مطابق یہ کہنا بھی ممکن نہیں ہے کہ انسان اس عمل کو "تیز تر" کر سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ذہنی محرک جو حالات کی رفتار بڑھانے پر آمادہ کر سکتا ہے، بجائے خود اس کے بارے میں بھی یہی فرض کرنا پڑے گا کہ وہ محض ایک سطحی علامت ہے جو معاشرے میں موجود معاشی عوامل کی عکاسی کرتی ہے۔ مارکس کے نزدیک خیالات بھی مادی اشیاء کی پرچھائیں ہیں۔ ایک جگہ وہ کہتا ہے:

"مادی زندگی میں پیداآوری کے طریقے زندگی کے معاشرتی، سیاسی اور روحانی ادوارات کی صورت گری کرتے ہیں۔ انسان کے احساسات سے اس کی زندگی ترتیب نہیں پاتی، بلکہ اس کے برعکس انسان کا سماجی ماحول اس کے احساس و شعور کو اپنے سانچے میں ڈھالتا ہے۔"

جوزف سٹالن نے مارکس کے فلسفے کی جو تفسیر پیش کی ہے اُس میں بھی یہی بات کہی گئی ہے۔ وہ بیان کرتا ہے:

"مارکس کے پیرووں کی مادی فلاسفی کے مطابق مادہ، نیچر اور زندگی ایک خارجی حقیقت ہے جو ہمارے ذہن سے باہر ایک مستقل بالذات وجود رکھتی ہے۔ مادے کو اولین اور بنیادی حیثیت حاصل ہے کیونکہ یہ تمام احساسات، تخیلات اور قلبی

واردات کا اصل ماخذ ہے۔ دماغ کی حیثیت ثانوی اور فروعی ہے کیونکہ یہ محض مادے اور مادی زندگی کا انعکاس ہے۔ خیالات مادے کی پیداوار ہیں۔ مادہ ارتقاء کے اعلیٰ منازل طے کر چکنے کے بعد انسانی دماغ کی شکل اختیار کرتا ہے اور دماغ ہی آلہ تخیلات ہے :

اس فلسفے کی بنیاد پر یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ سوسائٹی کی مجموعی زندگی کا مادی ارتقا اصل اہمیت کا حامل ہے اور چونکہ اس اجتماعیت کا مظہر اقتدار ریاست ہے، اس لیے فرد کو ریاست کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دینا ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ فرد کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ اپنا تاریخی فریضہ انجام دینے کے لیے ریاست کے ہاتھ میں محض آلۂ کار بن کر رہے۔

اگر غور کیا جائے تو یہ امر واضح ہے کہ اس نقطۂ نگاہ کو اختیار کر لینے کے بعد مارکسی فلسفے کے پاس تاریخ کو جانچنے کے لیے تاریخ سے بالاتر کوئی معیار اور مرجع باقی نہیں رہتا۔ یہ طرز فکر ایک طرف انسان سے تاریخ سازی کا مطالبہ کرتا ہے۔ لیکن دوسری طرف اس سوال کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دے سکتا کہ انسان سوسائٹی کے موجودہ ڈھانچے کو ایک "غیر طبقاتی معاشرے" میں تبدیل کرنے کے لیے آخر کیوں کوشش کرے؟ اس سوال کا جواب مہیا نہ ہو سکنے کی وجہ یہ ہے کہ مارکسی طرز فکر کا آغاز و انجام اس مفروضے پر ہوتا ہے کہ انسان خود تاریخی عمل کا ایک بے بس غلام ہے۔ مسٹر ڈبلیو ڈیون پورٹ کے بقول اس طرز فکر کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ ہمیں ایک "جدلی انسان" بنا دیا جائے مصنف مذکور اس ضمن میں مزید یوں رقم طراز ہے :

"یہ جدلی انسان DIALECTICAL MAN ایک طرح سے ریاست کے ہاتھوں میں ایک کٹھ پتلی ROBBOT ہے۔ وہ ایک جاندار ہے جسے حیوانی سطح پر اتار دیا گیا ہے۔ وہ ایک چیونٹی ہے جو دوسری بہت سی چیونٹیوں کے ساتھ ایک ضابطے میں کسی ہوئی اپنے بل کے اندر رہتی ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان کا یہ جدلی تصور نوع انسانی کو ایک غیر انسانی جامے میں پیش کرتا ہے اور آدمیت کی فلاح کا ایک ایسا نقشہ کھینچتا ہے جسے ہم ظلم اور جبر و استبداد کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں دے سکتے۔ اس میں گویا انسان

کو الٹا کر کے سر کے بل کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اس میں انسانیت اور آدمیت کے اب تک کے تصور کی بالکل قلب ماہیت ہو گئی ہے اور اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا گیا ہے۔ ایسا انسان ہماری دنیا کے لیے تباہی اور ہلاکت کا پیغام ہے اور اگر وہ زمین پر چھا گئے تو ہمارا تصورِ آدمیت کبھی زندہ نہیں رہ سکتا۔"

(۷)

جدلی مادیت کے جس فلسفے پر کلیت پسند ریاستوں کی تعمیر کی گئی ہے، اس کے برعکس ایک دوسرا تصور ہے جو دنیا کے اس حصے کے اقتصادی اور سیاسی ادارات میں کارفرما ہے جسے "آزاد دنیا" کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ فلسفہ اور یہ تصوّر انسانیت کے وقار اور اس کی انفرادی قدر و قیمت پر زور دیتا ہے اور فرد کو ایک مقصود بالذات وجود قرار دیتا ہے۔ اس فلسفے کے علمبرداروں کا کہنا یہ ہے کہ فرد کا ارتقا انسانیت کی ترقی کے لیے شرط لازم ہے اور جو معاشرہ فرد کے حقوق کو تسلیم نہیں کرتا وہ غیر ترقی یافتہ اور پس ماندہ ہے۔ قانون کی حکمرانی اور اجتماعی اقتدار کا جمہوری قواعد میں پابند ہونا، یہ دو ایسے اصول ہیں جو فرد کو سوسائٹی میں ایک شایانِ شان مقام کی ضمانت دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک آزاد معاشرے میں فرد کی جان، مال اور عزت کے تحفظ کا انتظام کیا جاتا ہے اور قانونی کارروائی کیے بغیر ان حقوق پر دست درازی نہیں کی جاتی۔ گویا کہ فرد کی رضا اور آزادانہ اجازت کے بغیر اس پر کوئی قدغن عائد نہیں کی جا سکتی اور ریاست کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ من مانے طریق پر فرد کے حقوق سلب کر سکے۔ ہیئتِ حاکمہ کا وجود محض اس لیے ہے کہ وہ فرد کو بلا روک ٹوک ترقی کے راستے پر گامزن ہونے دے اور اس راہ کی ساری رکاوٹوں کو دُور کرے۔ جو ریاست اور حکومت اس نظریے پر قائم ہو، اس کے بنیادی اصول یہ ہوں گے:

(۱) تمام انسان آزاد پیدا ہوتے ہیں اور پیدائش کے بعد وہ اپنے حقوق کے معاملے میں آزاد ہیں۔ شہری امتیازات کی بنیاد محض افادیتِ عامہ ہے۔

(۲) تمام سیاسی ادارات کا مقصد انسان کے فطری اور غیر متبدل حقوق کا تحفظ ہے۔

انسان کی جان، مال اور عزت وآبرو نہایت محترم ہے اور ظلم و عدوان کے مقابلے کا ہر فرد حق رکھتا ہے۔

(۳) حاکمیت کا مأخذ پوری قوم کے افراد ہیں۔ جب تک پوری قوم واضح طور پر کسی فرد یا مجموعہ افراد کی جانب یہ حاکمیت منتقل نہ کرے، وہ فرد یا افراد حکمرانی کا حق نہیں رکھتے۔

(۴) اقتدارِ عامّہ ایک امانت ہے اور جو شخص بھی اس امانت میں غلط طریق پر تصرّف کریگا۔ اس سے محاسبہ کیا جاسکے گا۔

(۵) تمام انسان پیدائشی طور پر مساوی ہیں اور اپنے خالق کی طرف سے بعض ناقابلِ سلب حقوق انھیں ودیعت کیے گئے ہیں۔ سب کو زندہ رہنے اور اپنی خوشی کے مشاغل اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ انھی حقوق کی محافظت کی خاطر حکومتیں شہریوں کی آزاد مرضی سے وجود میں لائی جاتی ہیں۔ اگر کوئی حکومت ان حقوق کے تحفظ میں ناکام رہے یا انہیں پامال کرنے کی کوشش کرے تو عوام کو ایسی حکومت کے بدلنے کا حق پہنچتا ہے اور وہ اس کے بجائے ایسی دوسری حکومت کو وجود میں لاسکتے ہیں، جو ایسے اصولوں پر مبنی ہو اور ایسے طریق پر اختیارات کو استعمال کرے جس سے عوام کی حفاظت و مسرت کے مقاصد زیادہ اچھے اور احسن طریق پر حاصل ہوسکیں۔ (ملاحظہ ہو امریکہ کا اعلانِ آزادی ۱۷۷۶ء)۔

دونوں نقطہ ہائے نظر کو سامنے رکھنے سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ انفرادی آزادی جو "آزاد دنیا" کا طرۂ امتیاز ہے، وہ مارکسی طرزِ فکر کے مطابق سوسائٹی کے امراض کا مداوا نہیں بن سکتی؛ یہ ان خرابیوں کو ایک دائمی شکل دے سکتی اور ان میں اضافے کا موجب بن سکتی ہے۔ جس معاشرے میں عدم مساوات موجود ہو، وہاں "مساویانہ قانونی تحفظ" سوسائٹی کی ناانصافیوں کو جاودانی زندگی بخش دے گا۔ مارکس کے فلسفے کے لحاظ سے سماجی ارتقاء صرف اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ ریاست کے اقتدار کو مقدس اور بالادست قرار دیا جائے تاکہ وہ ایک انحطاط پذیر سوسائٹی کو غیر طبقاتی سوسائٹی میں تبدیل کرسکے۔

(۸)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سماجی زندگی کو منظّم کرنے کے لیے ان دو حریف طرز ہائے فکر کی موجودگی میں اسلام اس مسئلے کا کیا حل پیش کرتا ہے۔

اگر ہم معاشرتی ارتقاء کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک فرد میں ذاتی تشخص کا احساس جس نے ہر انسان کی انفرادیت اور شخصیّت کو جنم دیا ہے، یہ احساس ترقی یافتہ معاشرے میں ایک ثانوی پیداوار ہے۔ جو معاشرے تہذیب کے ابتدائی مراحل طے کر رہے ہیں ان میں یہ احساس ناپید ہے، اور ان کے کسی فرد کو معاشرے کے بالمقابل اپنی انفرادیت کا شعور حاصل نہیں ہوتا۔ قدیم طرز کی سوسائٹی میں جماعتی شعور ہی اصل بنیاد ہوتی ہے جس سے انفرادی شعور ماخوذ اور متفرع ہوتا ہے۔ گروہ بحیثیت گروہ ہی سوچتا، محسوس کرتا اور فیصلے دیتا ہے اور فرد اس اجتماعی عمل کے خلاف نہیں جا سکتا کیونکہ اُسے اپنی خودی کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ قدیم طریق بود و باش رکھنے والا انسان اپنے قبیلے کا ایک جزو لاینفک ہوتے ہوئے اپنی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسا فرد نہیں سمجھتا جس کے کچھ ناقابلِ تنسیخ حقوق ہوں بلکہ وہ اپنے آپ کو ایک بڑے مجموعے کا جزوِ غیر ممیز خیال کرتا ہے۔ وہ قبائلی زندگی کے اعتقادی، اقتصادی اور سماجی بندھنوں میں اس طرح سے جکڑا رہتا ہے کہ گروہی زندگی کا احساس اُس کی رگ رگ اور ریشے ریشے میں خون کی طرح گردش کرتا ہے۔ یونانی تہذیب میں کنبے کو ایک قانونی شخصیت شمار کیا جاتا تھا۔ قدیم ہندو، جاپانی اور چینی معاشروں کی تنظیم کا بھی یہی حال تھا۔ ایک مشترک کنبے کا حصّہ ہونے کا احساس ان کے افراد میں بالکل قدرتی اور لابدی تھا۔ ان میں آج کل کی طرح انفرادیت کا کوئی احساس موجود نہ تھا۔ کنبے کا اقتدار زبردست اور بالاتر تھا۔ ان کی ضروریات تمام تر خاندانی ضروریات تھیں۔ جاپانی اور چینی معاشرے اب تک اس امر کی واضح شہادت دیتے ہیں کہ خاندان کے افراد اس حد تک خاندانی زندگی میں گم ہیں کہ ان کی کوئی شخصی یا انفرادی زندگی نہیں ہے جو خاندانی زندگی سے جدا اور قابلِ امتیاز ہو۔ بہرکیف انفرادیت کا احساس تہذیب و تمدّن کی علامت ہے۔ یورپ کی تاریخ بھی یہی بتاتی

ہے کہ یورپ میں انفرادیت کا ظہور عیسائیت کے فروغ کے بعد ہوا ہے۔ یہ اس مذہبی تعلیم کا نتیجہ تھا جس نے ہر فرد کو اپنی ذاتی اور انفرادی حیثیت میں اپنے خالق کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ قرار دیا ہے اور اس کے لیے حیات بعد الممات اور یوم الحساب کا تصور پیش کیا ہے۔ ایک ایک فرد کے اپنے مستقبل کے معاملے میں مختار و مسئول ہونے سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ خدائی احکام کی پیروی کا خود آزادانہ انتخاب کرے اور اسی شے نے انسانی فکر و دانش کو نشو و نما دی ہے اور اُسے گرد و پیش کی اُن بے شعور اور اندھی بہری طاقتوں سے نجات بخشی ہے جو اب تک اس کی قسمت کی مالک بنی رہی ہیں۔

تاہم اس امر میں شبہ نہیں ہے کہ انسان تنہا زندگی بسر نہیں کرتا، بلکہ وہ ایک سماجی عمل کی پیداوار ہے اور جس ماحول میں اس کی پرورش ہوتی ہے اس کے خیالات و احساسات اس ماحول میں کارفرما تہذیبی عوامل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس کا جسدِ خاکی بھی اُسے اپنے والدین سے ورثے میں ملتا ہے، اور اس کے والدین، اساتذہ، اعزّہ اور احباب اس کے قلب و روح پر اپنے اثرات کے گہرے نقوش مرتسم کرتے ہیں۔ انسان کا اپنا کچھ بھی نہیں ہے، ما سوائے اُس جد و جہد کے جسے انسان ماحول و میراث سے حاصل شدہ عطیات سے استفادے پر صرف کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو انفرادیت ایک خیالی اور موہوم چیز نظر آنے لگتی ہے لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود پھر بھی ایک پہلو ایسا ہے کہ اگر اُس پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی جگہ پر فرد کا بھی اجتماعی شعور کے ارتقاء میں بہت بڑا دخل ہے۔ وہ پہلو یہ ہے کہ حق و صداقت کا انکشاف اور شعور ہمیشہ ایک فرد کی ذات ہی کو ہوتا ہے۔ تمام سچائیوں کا آغاز شخصِ واحد کی اقلیت سے ہوتا ہے۔ اسی نقطۂ آغاز سے آگے چل کر ہر سچائی میں وسعت اور گیرائی پیدا ہوتی ہے، چراغ سے چراغ جلتا چلا جاتا ہے، حتیٰ کہ حقانیت کو معاشرے میں قبولِ عام حاصل ہو جاتا ہے۔ زندگی میں تخلیقی و تجدیدی صلاحیت کا سرچشمہ تمام تر فرد کی ذات ہے اگر فرد اور انفرادیت کا احترام موجود نہ ہو تو حق کے طلوع ہونے اور معاشرتی فضا میں اس کے بلند اور تابناک ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ اگر کسی معاشرے میں افراد کی انفرادی حیثیت میں توقیر اور عزّت

افزائی نہ ہو تو زندگی کے پیش آمدہ مسائل کو وہاں زیادہ دیر تک حل نہیں کیا جاسکتا یہی وجہ ہے کہ اس بات کو بار بار دہرایا گیا ہے کہ سماجی ارتقا کے لیے فرد کی تعظیم و تکریم شرطِ اوّل ہے۔ اگر فرد کو کلمۂ حق کہنے کی آزادی نہ ہوگی تو سچائی کا ظہور اور غلبہ معاشرے میں کیونکر ممکن ہوگا؟ یہی وجہ ہے کہ حکومتوں کو آئین کا پابند بنا کر ان کے اختیارات کو محدود و متعین کیا جاتا ہے تاکہ فرد کی آزادی و خودداری بیجا اور ناروا دست درازیوں سے محفوظ رہے۔ قانون کی حکمرانی اور عمومی اقتدار کو پابندِ جمہوریت بنانا، یہ تمام تدابیر ایسی ہیں جن کا مقصد افراد کے لیے مساوات، حریّت اور عزت کا برقرار رکھنا ہے۔ افراد ہی معاشرے کے عناصر ترکیبی ہیں۔ انہی کے لیے حکومتیں تشکیل کی جاتی ہیں اور معاشرے میں نظم و ضبط کو قائم رکھا جاتا ہے۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہے کہ فرد اور ریاست دونوں کے مفادات اپنی اپنی جگہ پر اہم اور قابلِ لحاظ ہیں اور جدید اشتراکی اور سرمایہ دارانہ نظام ہائے فکر نے اس معاملے میں انتہائی متضاد نقطہ ہائے نظر پیش کر کے جو دو گونہ مشکل پیدا کر دی ہے، اسے حل کرنے کے لیے ایک معتدل اور بیچ کی راہ نکالنا ضروری ہے۔ اسلام کی شان یہی ہے کہ وہ میانہ روی سکھاتا ہے اور انتہا پسندی سے بچاتا ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو اللہ نے اُمَّةً وَّسَطًا کا خطاب دیا ہے۔ میرے نزدیک فرد کی تربیت اس طریق پر ہونی چاہیے کہ وہ اپنے مفادات کو جماعت کی فلاح کے تابع رکھ سکے اور دوسری طرف حکمرانوں کو اپنے اختیارات اس اصول اور عقیدہ کو سامنے رکھ کر استعمال کرنے چاہییں کہ اگر فرد کی انفرادی حیثیت کو نظر انداز کر کے اسے محض ریاست کی عظمت و شوکت کے قیام کا آلۂ کار بنا لیا جائے تو فرد کی زندگی ایسی ضابطہ بندی کے شکنجے میں جکڑی جائے گی جس سے اس کی وہ تخلیقی اور اجتہادی صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ جائیں گی جن سے وہ جماعت کی عمومی فلاح کے لیے کام کر سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں فرد کو چاہیے کہ وہ ریاست کی حقیقت سے آگاہ رہے اور اس کے استحکام و ارتقاء کے لیے کوشاں رہے اور امانتِ اقتدار جن لوگوں کے سپرد ہے ان کا کام یہ ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کریں جن میں فرد کی خودی نشو و نما پاسکے اور وہ حق کی تلقین و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دے سکے۔ باہمی اعتماد، ایثار، اور رواداری کی فضا اسی طرح وجود میں آسکتی ہے۔ سماجی منظر کے دو انتہائی سرے ــــ آدمی اور نوعِ آدم، فرد اور ریاست اسی

طریق پر ہم آہنگی کے ساتھ اپنا اپنا کام کر سکتے ہیں۔ آخر یہ فرد ہی تو ہے جو اپنی انفرادی حیثیت میں اللہ کے سامنے ذمہ دار اور جوابدہ ہے۔ ریاست بحیثیت ریاست کے یا پوری انسانیت بحیثیت ایک نوع کے جواب دہ نہیں ہو سکتی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ معاشرے میں بنیادی طور پر جو شے مطلوب و مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ہر فرد کی زندگی سے بھوک، غربت، جہالت اور احتیاج کو رفع کیا جائے اور پھر اسے مادی سطح سے بلند کر کے اپنے خالق کی عبادت کرنے اور اس کے احکام بجالانے کے قابل بنایا جائے۔ کہنے کو خواہ کچھ ہی کیا جائے، اس امر سے مجالِ انکار نہیں کہ خاندان، قبیلہ، گروہ، قوم بلکہ پوری نسل انسانیت ایک مصنوعی وجود رکھتی ہے کیونکہ ان ناموں کی کوئی زندہ اور مشخص ہستیاں موجود نہیں ہیں۔ ان کا وجود محض اعتباری ہے اور محض اس حد تک حق بجانب ہے جس حد تک وہ فرد کی ترقی کے بقا و اضافہ کا ضامن ہے۔ اس لیے ان مصنوعی موجودات کے نام پر جن لوگوں کو کام کرنے اور فیصلے نافذ کرنے کا موقع ملتا ہے، انہیں یہ بات ہرگز فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ان کی اصل ذمہ داری فرد کی نشو و نما ہے۔ اسی طرح فرد بھی اپنی جگہ پر تب ہی مستفید ہو سکتا ہے، جبکہ وہ ہیئت اجتماعی کو برقرار رکھنے اور مضبوط بنانے میں ایثار و بے نفسی سے کام لے جس طرح دانہ خاک میں مل کر اور پانی میں ڈوب کر ایک پودے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، پھل پھول دیتا ہے اور آخر کار بیجوں کی ایک فصل وجود میں لاتا ہے، اسی طرح فرد جب اپنی خوشی سے اپنی انفرادیت کو اجتماعیت میں ضم کرتا ہے اور معاشرے کے دیگر اجزاء مثلاً خاندان، قبیلہ اور قوم کے ساتھ مل جل کر کام کرتا ہے تو اس کی حقیقی بھلائی پروان چڑھتی اور برگ و بار لاتی ہیں۔ یہی حقیقت ہے جس کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ	تم بھلائی نہیں حاصل کر سکتے جب تک تم اس میں سے خرچ نہ کرو جس سے تم محبت کرتے ہو۔

مسلمان سے اس امر کا مطالبہ ہے کہ وہ رضاکارانہ طور پر انفاق سے کام لے۔ اسے سورج کی طرح بلا معاوضہ روشنی اور گرمی فراہم کرنی چاہیے۔ زکوٰۃ مسلمان کے اسی طرزِ فکر و عمل کا ایک مظہر ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ فرد جماعت کی فلاح و بہبود کے لیے قربانی پیش کرے اور اپنے مال سے

دستبردار ہو جائے۔ انسان کسی شے کا حقیقی مالک نہیں ہے، اس لیے جس مال کا دوسرا بہتر مصرف ہو سکتا ہے، اُسے روک کر رکھنے کا اُسے حق نہیں ہے۔ جب انسان اپنے مفادات کو تج دیتا ہے اور دوسروں کو اپنے نفس پر ترجیح دیتا ہے، اس وقت انسان فرشتوں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔

اوپر مَیں نے یہ حقیقت واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام ایک بہتر اور اعلیٰ تر دنیا کو وجود میں لانے کے لیے کیا طریقِ کار اختیار کرتا ہے۔ اسلام کا نصب العین ہمہ گیر اور غیر محدود ہے۔ اسلام نے جو بلند ترین اخلاق و کردار کے معیارات مقرر کیے ہیں ہم جدوجہد کرتے ہوئے درجہ بدرجہ ان کے قریب تر پہنچ سکتے ہیں، لیکن آخری منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہم اپنی تمام تر مساعی کے باوجود معیارِ کمال سے فروتر ہی رہیں گے۔ اور اس سے جتنا نیچے ہم ہوں گے، اپنی پستی کا احساس ہمیں اتنا ہی زیادہ کوشش پر اُبھارے گا۔ اسلامی مقاصد اور نصب العین کے حصُول کے لیے مسلسل کوشش کیے چلا جانا اسی کا نام "جہاد" ہے۔ اس لفظ کے معاملے میں بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، لیکن اس کے اصل معنی یہی ہیں۔ مَیں دوبارہ یہی کہوں گا کہ ایک مسلمان کا لگاتار اپنے مقاصد کے لیے جدوجہد جاری رکھنا یہی سب سے بڑا جہاد ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جہاد کی مختلف شکلیں اور صورتیں ہو سکتی ہیں، اللہ کے احکام و فرامین جن کی تشریح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و فعل سے فرما دی ہے، ان کی ہم جتنی زیادہ مضبوطی کے ساتھ پیروی کریں گے، ہمارا اخلاقی مرتبہ اور وزن اسی تناسب سے بڑھتا چلا جائے گا۔

(۹)

آخر میں میری گزارش یہ ہے کہ ہماری تعلیم گاہوں میں "اسلامیات" کا موضوع اسلام کا کلی نصب العین ہونا چاہیے۔ کامل حق کی تلاش جہادِ اکبر ہے۔ ایک ہی دفعہ جان دے دینا آسان ہے۔ لیکن جاہلیت کے خلاف مسلسل جنگ کرنا، اور چھوٹے موٹے قیصروں کے علی الرغم کلمۂ حق کا اعلان کرنا، میرے نزدیک یہ حبِّ الٰہی کا ایک برتر اور بلند تر مظہر ہے۔

اسلامیات کے بارے میں مزید ایک غلط فہمی یہ ہے کہ اسے بعض اوقات محض تفاسیرِ قرآن،

انتخاب حدیث، اور قدیم کتب فقہ کے مطالعے تک محدود کر لیا جاتا ہے۔ یہ بھی صحیح اسلامی نقطۂ نظر نہیں ہے۔ طبیعیات، علم کیمیا، علم الحیات، ریاضی، فلکیات، زراعت، طب، قانون اور تاریخ وغیرہ کا مطالعہ بھی اگر اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر کیا جائے کہ فرد کی زندگی پاکیزہ ہو اور پوری انسانیت کے لیے ذریعۂ اتحاد و ارتباط ثابت ہو، تو یہ مطالعہ بھی اسلامیات ہی کا ایک حصہ ہے۔

اسلامی طرزِ حیات میں دین و دنیا کے مابین کوئی منافات و امتیاز نہیں ہے۔ اسلام میں "قیصر کا حصہ قیصر کو ادا کرنے" کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہاں قیصر کا کچھ سرے سے ہے ہی نہیں، سب کچھ اللہ کا ہے۔ اسلام قیصریت کا مخالف ہے، کیونکہ قیصر اس راہ میں کانٹا ہے جس پر چل کر آدمی اپنے خدا تک پہنچتا ہے۔ ہر شکل میں برائی کا مقابلہ جہاد ہے۔ نوعِ انسانی کے شہداء کی تاریخ درحقیقت شر کے خلاف جہاد کی تاریخ ہے۔ جان دینے والوں نے اپنی جانیں اسی لیے دی ہیں کہ سبیل اللہ کے موانع دور ہوں اور اللہ کے بندے صراطِ مستقیم پر گامزن ہو کر اپنی منزلِ مقصود تک رسائی حاصل کریں۔ قیصر شاہراہ عام پر ایک سنگِ گراں ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ ایک جاروب کش کی خدمت انجام دے سکتا ہے لیکن اگر وہ خدا کے قانون کے بجائے اپنا قانون چلائے اور اس طرح خدائی قانون کے خلاف جنگ کرے، تو خدائی قانون کے مطابق اس کا رستے سے ہٹایا جانا مقدر ہو چکا ہے۔ تمام قیاصرہ صفحۂ تاریخ پر حرفِ غلط کی حیثیت رکھتے ہیں اور کسی نوحہ خواں اور گریہ کناں کے بغیر ان کا مٹ جانا یقینی ہے۔ اسلام اپنے نظام میں قیصر کو تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ حاکمیت اور پادشاہی اللہ کے لیے ہے وَلِلّٰهِ مَافِي السَّمٰوَاتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ۔ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، اللہ کی ملکیت ہے۔ تمام طاقت و اقتدار اسی کے لیے ہے۔ اس میں کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔

اس لیے اسلام کے طالب علم کو شعبہ ہائے حیات میں دینی و غیر دینی کی تفریق کا مہلک نظریہ تسلیم نہیں کرنا چاہیے۔ پوری زندگی ایک وحدت ہے اور مشیتِ الٰہی سے وجود میں آئی ہے۔ اس میں ناپاک اجزاء کا کوئی دخل نہیں۔ ایک مسلم اسکالر کو محبت اور گرم جوشی

کے ساتھ اپنے اسلامی نصب العین سے ہمکنار ہونا چاہیے اور الٰہ الحق کی عبادت و عبودیت کے جذبے میں سرشار ہو کر تحصیلِ علم کا کام کرنا چاہیے۔

اس طریقے سے نہ صرف اس کی انفرادی تکمیل ہو گی بلکہ وہ پوری انسانیت کو ان ہے راہرویوں سے بچالے گا جو خدا کے حقوق اور قیصر کے حقوق کی مصنوعی تفریق کا نتیجہ ہیں۔

وقت کی پکار یہی ہے، حالات کا تقاضا یہی ہے۔ خوش بخت اور خوش نصیب ہیں وہ مردانِ کار جو اس پکار کو سنیں اور اپنی پیہم جد و جہد کے ذریعے سے اُس اعلیٰ و ارفع نصب العین کو حاصل کریں جس کے لیے انسانیت آغازِ تخلیق سے اب تک لڑتی چلی آ رہی ہے۔